دیارِ غرب کے مشاہدات و تاثرات

(۱)

سعید احمد اکبرآبادی

۵۱ء کا جبکہ میں کلکتہ میں تھا ذکر ہے ایک دن صبح کے وقت میں اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، رسیور اٹھایا تو آواز آئی کہ میں ولفرڈ کینٹول اسمتھ ہوں، کل کلکتہ آیا ہوں اور یہاں گرانڈ ہوٹل میں مقیم ہوں، آپ سے ملنا چاہتا ہوں، جس وقت آپ کہیں حاضر ہو جاؤں، میں نے موصوف کی کتاب "اسلام ان ماڈرن انڈیا" پڑھ رکھی تھی اسی لئے اُن سے خوب واقف تھا، میں نے جواب دیا "ابھی میرے دفتر میں تشریف لے آیئے۔ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوگی" انھوں نے شکریہ ادا کیا۔ اور گفتگو ختم ہوگئی، پندرہ بیس منٹ کے بعد پروفیسر اسمتھ پہنچ گئے، یہ میری اُن کی پہلی ملاقات تھی، رسمی طور پر دونوں طرف سے مزاج پرسی کے بعد موصوف نے خالص علمی گفتگو شروع کر دی جس کا موضوع کچھ اسلام اور زیادہ تر اقبال کی شاعری اور فلسفہ تھا، اس سلسلہ میں میں نے جو کچھ کہا پروفیسر اسمتھ اُس کے بعض بعض فقرے اپنی نوٹ بک میں لکھتے رہے۔

چونکہ یہ میرے دفتر کا وقت تھا اور خود معزز مہمان کو بھی اس کا احساس تھا اس لئے گفتگو زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکی، جب رخصت ہونے لگے تو دوسرے دن انھوں نے مجھ کو طعام شب پر ہوٹل میں مدعو کیا، جسے میں نے بڑی خوشی سے منظور کر لیا۔ دوسرے دن حسب وعدہ میں مقررہ وقت پر پہونچا۔ اور ہم دونوں کھانے کی میز پر بیٹھے تو سب سے بڑا تاثر پروفیسر اسمتھ کی شخصیت کے متعلق مجھ کو اس واقعہ سے ہوا کہ انگریزی ہوٹلوں کے عام قاعدہ کے مطابق کھانا لانے سے پہلے ویٹر نے جب پوچھا کہ میں شراب (DRINK) کونسی لاؤں؟ تو

اسمتھ صاحب نے صاف انکار کر دیا اور پھلوں کا عرق لانے کا آرڈر دیا، میں نے خیال کیا کہ میری وجہ سے ایسا کر رہے ہیں اس لئے میں بولا " آپ جو پیتے ہیں وہ پیجئے، اُس میں تکلف کی ضرورت نہیں ہے، میں فروٹ جوس پی لوں گا،" اس کے جواب میں انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا " شراب اور سگرٹ کو آج تک ایک مرتبہ بھی میں نے مُنہ نہیں لگایا ہے" مجھ کو اس پر تعجب ہوا اور میں نے اس سلسلہ میں مزید سوالات کئے تو معلوم ہوا کہ صرف یہی نہیں بلکہ بعض چیزیں جو مغربی زندگی کے نمایاں خد و خال سمجھی جاتی ہیں موصوف کا دامن اُن سے بھی کبھی آلودہ نہیں ہوا میں پروفیسر اسمتھ کی علمی قابلیت اور ذوقِ تحقیق کا تو پہلے سے قائل تھا ہی اس واقعہ نے اُن کے اخلاق اور کردار کا بھی دل پر نقش جما دیا جو آٹھ مہینہ مسلسل اُن کے ساتھ رہنے اور ان کو بہت قریب سے جلوت میں اور خلوت میں دیکھنے سے اور گہرا ہو گیا، پھلوں کے عرق کا ایک ایک گلاس پینے کے بعد کھانا شروع ہوا تو کھانے پر اور اس سے فراغت کے بعد ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ہم دونوں میں دیر تک مفصل گفتگو ہوئی اور اس سب کا موضوع اسلام اور عالمِ اسلام کی مختلف تحریکات تھا، اسی سلسلہ میں موصوف نے بتایا کہ حال میں ہی مک گل یونیورسٹی مونٹریل (کناڈا) میں اسلامی علوم و فنون کا ایک انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا ہے اور وہ اس کے ڈائرکٹر ہیں پھر انھوں نے پوچھا کہ کیا میں سال دو سال کے لئے وہاں آنا پسند کروں گا، جب میں نے جواب اثبات میں دیا تو انھوں نے زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ شکر گذاری کا اظہار کیا اور اب مجلس برخاست ہو گئی اور اسمتھ صاحب دوسرے دن (غالباً ڈھاکہ کے لئے) روانہ ہو گئے، اب ہم دونوں میں ایسا تعلق پیدا ہو گیا تھا کہ خط و کتابت برابر جاری رہی اور ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنی تصنیفات اور مقالات کا ایک ایک نسخہ بھی بھیجتے رہے، اسمتھ صاحب نے مونٹریل واپس ہوتے ہی مک گل یونیورسٹی میں میرے بلانے کی تحریک شروع کر دی اور آخر کار تمام رسمی کارروائیوں کے بعد ۱۹۵۲ء میں دو سال کے لئے بحیثیت فیلو کے میرے تقرر کا دفتری خط پہونچ گیا، میرے عزیز دوست (پروفیسر) خلیق احمد صاحب نظامی کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے علی گڈھ سے لکھا " یہ چیز آپ کے مرتبہ سے گری ہوئی ہے آپ کو تو وہاں پروفیسر ہو کر جانا تھا " لیکن یہاں تو عالم یہ تھا کہ ؎

" تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے "

مجھ کو شروع سے ہی یورپ جانے اور بقول اکبر الٰہ آبادی " خدا کی شان " دیکھنے کا ارمان تھا اس لئے

میں نے اس پیش کش کو قبول کر کے کناڈا جانے کا پکا ارادہ کر لیا، لیکن ہوا یہ کہ جب میں اس سلسلہ میں مغربی بنگال کے ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن سے ملا تو انھوں نے بتایا کہ چونکہ میں کنٹرکٹ پر ہوں اس لئے مجھ کو دو برس کی رخصت نہیں مل سکتی، البتہ ہاں استعفیٰ دیکر میں جانا چاہوں تو جا سکتا ہوں، ظاہر ہے استعفیٰ دینے کی ہمت مجھ میں نہیں ہو سکتی تھی، مجبوراً دل کی حسرت دل میں رہ گئی اور میں نے اسمتھ صاحب کو معذرت لکھ دی، اس موقع پر اس کا اظہار نامناسب نہیں ہے کہ یوں تو اسمتھ صاحب نے میری سب ہی کتابیں پڑھی ہیں اور برہان بھی اُن کی نظر سے گذرتا رہتا ہے لیکن میری دو کتابوں سے وہ زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں، نمبر اول پر مولانا عبید اللہ سندھی اور اُن کے ناقد' اور اس کے بعد "مسلمانوں کا عروج زوال" اول الذکر کتاب جو درحقیقت کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں اور اسی لئے ندوۃ المصنفین کی مطبوعہ بھی نہیں ہے اُن چند مضامین کا مجموعہ ہے جو میں نے قلم برداشتہ معارف اعظم گڈھ کے ایک مضمون کے جواب میں لکھ دیئے تھے، بعد میں سندھ ساگر اکاڈمی لاہور نے انہیں مضامین کو میری اجازت سے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ اور پھر اس کا انگریزی ترجمہ بھی سنا ہے کہ شائع ہو گیا ہے، اگرچہ یہ میری نظر سے اب تک نہیں گذرا، بہرحال یہ عجیب بات ہے کہ خود میری نظر میں یہ کتاب صرف ایک سرسری اور قلم برداشتہ مضمون کی چند قسطوں کا مجموعہ ہے لیکن اس کے باوجود ہندو پاک سے باہر کے علمی حلقوں میں میرے تعارف کا ذریعہ بڑی حد تک یہی کتاب ہے چنانچہ پروفیسر اسمتھ نے اپنی معرکہ آرا کتاب "اسلام اِن دی ماڈرن ہسٹری آف دی ورلڈ" میں اس کا حوالہ دیا ہے، اور ان کے علاوہ ڈاکٹر جمال الدین الشیال نے اپنی عربی کتاب "الحرکات الاصلاحیۃ ومراکز الثقافۃ فی الشرق الاسلامی الحدیث" کی جلد اول میں اس کتاب کو اپنے انگریزی کتابوں کے مآخذ میں شمار کیا ہے۔

اسمتھ صاحب کو میری مجبوری کا علم ہوا تو انہیں افسوس ضرور ہوا، لیکن اب آئندہ وہ کسی اور بہتر موقع کے منتظر رہے، ہم دونوں میں خط و کتابت کا اگرچہ گاہے ماہے۔ سلسلہ تو جاری تھا ہی، ۱۹۵۸ء میں میں کلکتہ چھوڑ کر علی گڈھ آیا اور شعبۂ دینیات سے متعلق ہوا۔ میرے لکھے بغیر کسی اور ذریعہ سے پروفیسر اسمتھ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے مجھ کو ایک مفصل خط لکھا جس میں تحریر تھا "مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا شعبۂ دینیات

جس کس مپرسی کے عالم میں تھا اسے دیکھ کر سخت افسوس ہوتا اور مسلمانوں کی بے حسی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء میں میں علی گڑھ گیا اور یونیورسٹی میں ایک تقریر کرنے کا موقع ملا تو میں نے ذمہ داران یونیورسٹی کو اس طرف توجہ دلائی اور کہا کہ یورپ اور امریکہ میں اسلامی دینیات پر جو کام ہو رہا ہے اور وہاں اس مضمون کو جو اہمیت دی جاتی ہے افسوس ہے کہ اس یونیورسٹی میں جو مسلم یونیورسٹی کہلاتی ہے یہ مضمون اسی قدر بے وقعت ہے ،، اس کے بعد موصوف نے لکھا " مجھ کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ میری یہ آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی اور اب یونیورسٹی نے آپ کو اس شعبہ کے صدر کی حیثیت سے بلایا ہے۔ توامید ہے آپ اس شعبہ کا حق ادا کریں گے چونکہ اس کی تحریک میں نے ہی کی تھی اس لئے آپ کے علی گڑھ پہونچنے پر مجھ سے زیادہ کسی کو خوش ہونے کا حق نہیں ہے۔ اور میری طرف سے آپ اس پر دلی مبارکباد قبول کیجئے" میں جب علی گڑھ آیا تو اسمتھ صاحب کا یہ خط میں نے وائس چانسلر کرنل زیدی صاحب کو بھی دکھا دیا تھا تاکہ انہیں معلوم ہو کہ یونیورسٹی میں شعبۂ دینیات کی طرف سے بے توجہی کو غیر مسلم سنجیدہ فکر حضرات تک کس طرح محسوس کرتے ہیں ،

سُن تو سہی ہے خلق میں تیرا افسانہ کیا ❊ کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

جو قوم خود اپنی تہذیب وثقافت اور اُس کے بنیادی پس منظر اور اس تہذیب کے ترکیبی عناصر کی قدر وقیمت نہیں پہچانتی اور ان کی اہمیت کا عملی اعتراف نہیں کرتی وہ محض دوسروں کی نقالی اور پیروی کے سہارے اپنے لئے عزت وعظمت کا کوئی مقام حاصل نہیں کرسکتی، یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں جگہ جگہ مستقل شعبۂ دینیات (DIVINITY COLLEGE) کا اہتمام وانصرام ہے اور یونیورسٹیوں کے احاطہ میں اُن کی وہی اہمیت ہے جو سائنس اور آرٹس کے دوسرے شعبوں کی ہے، میں نیویارک میں کولمبیا یونیورسٹی گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یونیورسٹی کے صدر دروازہ پر ہی نہایت جلی قلم سے جو عبارت کندہ ہے اس میں لکھا ہوا ہے " یہ یونیورسٹی فلاں سنہ میں خدا کے نام کی عظمت قائم کرنے کی غرض سے وجود میں لائی گئی " اسی طرح کی عبارتیں دوسری یونیورسٹیوں میں لکھی نظر آئیں، دنیا کی موجودہ ترقی یافتہ قومیں اپنے مذہب، کلچر، اور ثقافت کے لئے کیا کچھ کر رہی ہیں، اُن سے قطع نظر! خود اپنے ملک میں دیکھئے، ہمارے برادرانِ وطن اپنی پرانی تہذیب اور مذہب اور اپنے قومی علوم وفنون کی ترقی اور عروج کے لئے کیا کچھ نہیں کر رہے ہیں؟ اسی کا اثر اور نتیجہ ہے کہ

ہندو مغربی علوم و فنون میں کمال پیدا کرنے کے بعد بھی ذہن اور دماغ، طریق بود و ماند اور فکر و نظر کے اعتبار سے ہندو ہی رہے اور یہاں یہ عالم ہوا کہ مغربی تہذیب میں بالکل جذب ہو کر اپنی خودی کو بھول گئے، سر ارک ایشبی (SIR ERIC ASHBY) جو عہدِ حاضر کے برطانوی سائنٹسٹ اور ماہر تعلیم ہیں اُن کا ایک بڑا فاضلانہ مقالہ انڈیا اور افریقہ کی یونیورسٹیوں پر لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے ایک بلیٹن میں ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا اس میں انھوں نے اسی چیز کا رونا رویا ہے کہ چونکہ ہندوستانی یونیورسٹیوں میں مذہب اور مشرقی علوم و فنون کی تعلیم پر زیادہ زور نہیں دیا گیا اس لئے اُن یونیورسٹیوں سے ہندو اور مسلمان جو تعلیم پاکر نکلے وہ اس تاریخ اور فلسفہ سے تو متاثر تھے جس کی جڑیں بحرِ روم اور عیسائیت میں ہیں لیکن وہ خود اپنی تہذیب اور کلچر کی قدروں سے نا آشنا رہے، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں کثرت سے یونیورسٹیاں ہیں لیکن اس کے باوجود — جیسا کہ اڈورڈ شلس (EDWARD SHILS) نے ابھی حال میں لکھا ہے۔

"ہندوستان میں کوئی ذہنی طبقہ (INTELLECTUAL COMMUNITY) موجود نہیں ہے اور ایک حد تک اس کی وجہ یہی ہے کہ ملک میں ثقافتی اداروں کی کمی ہے اور یونیورسٹیوں نے ایشیائی کلچر کے چیلنج کا جواب بہت ہی کمزور طریقہ پر دیا ہے۔" فاضل مقالہ نگار نے جو بات کہی ہے وہ ہندوستان کے دو بڑے فرقوں ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے یکساں کہی ہے لیکن ہر شخص بنگال، بہار، مدراس، مہاراشٹر اور گجرات اور یو پی میں محسوس کر سکتا ہے کہ یہ بات مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ پر زیادہ صادق آتی ہے اور ہندوؤں پر کم اور اس کی وجہ وہی ہے جس کا ذکر کیا گیا' جو حالت ہے سو ہے، مگر زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ خود ہم کو اس کا احساس نہیں اور احساس ہے تو سات سمندر پار بیٹھی ہوئی اُس قوم کے بالغ نظر افراد کو ہے جس کی تہذیب کی نقالی میں ہم خود اپنے آپ کو بھول گئے ہیں، یہ بالغ نظر افراد وہ ہیں جو ایشیائی اقوام کی ذہنی اور دماغی پسماندگی و زبوں حالی کے اسباب کا سُراغ لگا رہے اور اس پر ریسرچ کر رہے ہیں،" تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو"

بہرحال اسمتھ صاحب کو میرے علی گڈھ آنے سے جو خوشی ہوئی اُس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ اسکو یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کی تنظیم جدید کی طرف ایک قدم سمجھتے تھے اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اب یونیورسٹی میں آنے کے بعد میرے لئے کناڈا جانا آسان ہوگا، چنانچہ وہ انتظار کرتے رہے، آخر جب مجھ کو یہاں تین برس ہوگئے

اور میں یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط کے مطابق باہر جانے کے لئے رخصت لینے کا حق دار ہوگیا تو انھوں نے دوبارہ سلسلہ جنبانی کی، مگر عجیب بات ہے موصوف سنہ ۶۲ء کے مارچ میں پھر علی گڈھ آئے تھے اور تین دن یہاں ٹھہرے تھے، ان دنوں میں متعدد بار جلوت میں اور خلوت میں اُن سے دیر تک گفتگو رہی، لیکن انھوں نے اس کا اظہار ہرگز نہیں کیا کہ میں عنقریب بلایا جاؤں گا۔

ماہ جون سنہ ۱۹۶۲ء کا اکثر حصہ میں نے مفتی صاحب (مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی) کے ساتھ چکروتہ پہاڑ پر گذارا، وہاں سے علی گڈھ واپس آیا تھا کہ ایک دن اچانک اسمتھ صاحب کا رجسٹرڈ خط مونٹریل سے وصول ہوا، کھول کر دیکھا تو اُس میں بڑی محبت آمیز زبان میں ایک برس کے لئے بحیثیت وزٹنگ پروفیسر کے انسٹیٹوٹ آف اسلامک اسٹڈیز مک گل یونیورسٹی میں آنے کی پیش کش تھی، کرنل زیدی تو یہاں تھے نہیں ڈاکٹر یوسف حسین خان پرو وائس چانسلر موجود تھے۔ میں نے یہ خط موصوف کو دکھایا، بڑے خوش ہوئے اور فرمایا "آپ ضرور چلے جائیے، اس سے فائدہ آپ کو اور اُن کو دونوں کو ہی ہوگا، اس کے علاوہ احباب اور گھر والوں نے بھی مشورہ یہی دیا۔ چنانچہ میں نے اللہ کا نام لے کر جانے کا ارادہ کرلیا اور ادھر میں نے اسمتھ صاحب کو اُن کے شکریہ کے ساتھ اپنی منظوری کی اطلاع دی جس پر انھوں نے فوری کارروائی یہ کی کہ B.O.A.C کمپنی کو لکھ کر میری آمد و رفت کا کرایہ جمع کردیا اور ادھر میں نے رخصت کی درخواست دی اور مذکورۂ بالا کمپنی کو لکھ کر ۹ ستمبر کے لئے جہاز میں سیٹ رزرو کرالی، اس اثنا میں روانگی کے لئے جو ضروری اور رسمی کارروائیاں تھیں یعنی پاسپورٹ اور ویزا کا حاصل کرنا، رزرو بنک آف انڈیا سے اجازت حاصل کرنا، ٹیکہ لگواکر ہیلتھ سرٹیفکٹ لینا اور کپڑوں کی تیاری وغیرہ یہ سب چلتی رہیں، یہاں علی گڈھ یونیورسٹی میں رواج ہے کہ کوئی شخص یورپ اور امریکہ وغیرہ جاتا ہے تو روانگی سے ایک ڈیڑھ ہفتہ پہلے اور واپسی کے بعد دوستوں کی طرف سے شاندار پارٹیوں اور دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، لیکن میں اس رواج کو اخلاقی حیثیت سے معیوب اور مذموم سمجھتا ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جانے والے کے جو خوشحال اور وسیع آمدنی والے احباب ہیں وہ ان پارٹیوں کا انتظام بڑی سہولت سے کرسکتے ہیں، مگر دوسرے احباب جو اس حیثیت کے مالک نہیں ہوتے خواہ وہ مخلص کتنے ہی ہوں، سخت مشکل میں پھنس جاتے ہیں، اگر وہ دعوت کریں تو انہیں زیربار ہونا پڑے گا۔

اور اگر نہ کریں تو دل ہی دل میں اُن کو خفت اور شرمندگی کا احساس ہوگا، اس کے علاوہ دوسری وجہ یہ ہے کہ یورپ جانے سے پہلے اور آنے کے بعد ضرورت ہے کہ ہلکی پھلکی غذائیں کھائی جائیں تاکہ معدہ کی حالت ٹھیک رہے، مگر ان دعوتوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ثقیل و متنوع اور مرغن غذائیں پیہم کھاتے رہنے سے معدہ کی حالت خراب ہو جاتی ہے اور طرح طرح کی شکایات پیدا ہو جاتی ہیں، ان سب سے قطع نظر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ اس قدر طویل و دراز سفر میں جانے سے پہلے ہر شخص کی یہ طبعی خواہش ہوتی ہے کہ اب روانگی میں جو تھوڑے بہت دن باقی رہ گئے ہیں وہ گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ رہنے اور ان کے ساتھ کھانے پینے میں صرف ہوں مگر یہ دعوتیں اس کا موقع نہیں دیتیں اور اس طرح گویا یہ گھر کے لوگوں کی حق تلفی اور انکی بد دلی کا باعث ہوتی ہیں، اس بنا پر متعدد مخلص احباب بیحد مصر رہے مگر میں نے کسی کے ہاں چائے کی دعوت بھی قبول نہیں کی اور خوش اسلوبی کے ساتھ معذرت کر دی، البتہ ہمارے ڈپارٹمنٹ کی تھیالوجیکل سوسائٹی نے ایک الوداعی پارٹی دینی چاہی میں نے اُسے منظور کر لیا، چنانچہ ۸ ر ۹ ر ستمبر کی درمیانی شب میں سوسائٹی کی طرف سے ڈنر ہوا جس میں وائس چانسلر پرو وائس چانسلر دوسرے حکام یونیورسٹی اور مختلف شعبوں کے معزز اساتذہ اور طلبا ر نے شرکت فرمائی، کھانے سے فراغت کے بعد جناب وائس چانسلر صاحب نے اقدار و بندہ نوازی ایک مختصر تقریر کی اور اس کے جواب میں میں نے بھی پانچ چھ منٹ یونیورسٹی کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے میری رخصت منظور کر کے مجھ کو اس پیش کش سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا۔ اس کے بعد مجلس برخاست ہوئی اور میں گھر گیا، ہوائی جہاز کے سفر میں چالیس پونڈ تک کا سامان فری لیجانے کی اجازت ہوتی ہے اس لئے میں نے مختصر سامان لے لیا جو کپڑوں اور کتابوں پر مشتمل تھا، بستر، تولیہ، صابون وغیرہ کا تو سوال ہی نہیں کیونکہ یہ چیزیں عمدہ سے عمدہ ہر جگہ مہیا ہوتی ہیں، کتابوں کا بوجھ خواہ مخواہ بندھا ان میں کوئی کتاب ایسی نہیں تھی جو وہاں کی لائبریری میں موجود نہ ہو، البتہ جو ایک المونیم کا لوٹا ساتھ لے لیا تھا وہ پورے سفر میں بڑا آرام دہ اور کارگزار ثابت ہوا، کیونکہ مغربی زندگی میں اس قسم کی چیز کا کوئی تصور ہی نہیں ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ لوگ اسے حیرت و استعجاب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بغیر طہارت مکمل نہیں ہوتی اور کم سے کم ایک مسلمان کے لئے تو بالکل ناگزیر ہے، اس طرح سامان درست کیا، کچھ دیر بچوں اور اعزا و اقربا

سے بات چیت کی صبح ہی روانہ ہونا تھا اور بچوں سے اتنی طویل مدت کے لئے جدا ہونے کا پہلا اتفاق تھا۔ اس لئے طبیعت متاثر تھی، مگر ۱۹۴۷ء میں آزادی کے صدقہ میں میرے سر پر جو قیامت گذری ہے اُس نے ڈھیٹ بنا دیا ہے اور اب زندگی کا کوئی حادثہ حادثہ نہیں معلوم ہوتا، پھر مولانا حالی کا یہ شعر بھی یاد تھا کہ

طبیعت کو ہوگا قلق چند روز ✦ بہلتے بہلتے بہل جائے گی

اس کے علاوہ عربی کے یہ شعر اکثر پڑھتا تھا۔

لا یمنعنك خفض العیش فی دعةٍ ✦ نزوعُ نفسٍ الی اھلٍ و اوطانٖ

تلقی بکل بلادٍ ان حللتَ بھا ✦ اھلاً باھلٍ وجیراناً بجیرانٖ

اس لئے طبیعت کو سمجھا بجھا کر سو گیا، صبح ہوئی تو نماز کے بعد سے ہی احباب کی آمد و رفت شروع ہو گئی، آخر اپر انڈیا اکسپریس جو سوا آٹھ بجے صبح کے لگ بھگ دہلی جاتی ہے اُس سے روانہ ہونے کے لئے اسٹیشن پہونچا تو یہ دیکھ کر کچھ خوشی اور کچھ ندامت سی ہوئی کہ میرے عزیزوں کے علاوہ یونیورسٹی کے عمائد، ملازمین، اساتذہ اور طلبا اور شہر کے احباب کا ایک بڑا مجمع الوداع کہنے کے لئے وہاں موجود تھا۔ ایسے موقع پر عام دستور یہ کہنے کا ہے کہ "فلاں فلاں حضرات لائقِ ذکر ہیں" مگر میرے نزدیک یہ طریق بیان بھی غیر اخلاقی چیز ہے، اس سے اُن لوگوں کے خلوص اور محبت کی توہین ہوتی ہے، جن کو نا قابلِ ذکر قرار دیکر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اس لئے میں نام کسی کا نہیں لوں گا، البتہ قلب اب تک اُن کے جذبۂ محبت و خلوص کے اظہار پر سراپا تشکر و امتنان ہے، بعض احباب جو اسٹیشن پر نہ آسکے تھے وہ دہلی پہونچ گئے۔ اور بعض نے خود میرے ساتھ دہلی تک کا سفر کیا، ٹرین آئی اور معانقوں اور مصافحوں کے بعد میں روانہ ہوا۔ گیارہ بجے کے قریب دلی پہونچکر دفتر برہان پہونچا، شام کے سات بجے تک احباب کی آمد و رفت اور ملاقات کا سلسلہ جاری رہا، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم سے تو خیر میرا رشتہ بھی تھا، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے مگر اس کے باوجود حق یہ ہے کہ ہم تینوں آپس میں سگے بھائیوں سے زیادہ تھے، بھائی حفظ الرحمٰن کو دنیا سے رخصت ہوئے کل ایک مہینہ آٹھ دن ہوئے تھے اس لئے یہ غم تازہ تو تھا ہی دلی پہنچ کر یہ زخم اور ہرا ہو گیا اور ساتھ ہی اس خیال نے ستانا شروع کر دیا کہ مفتی صاحب مولانا مرحوم کی بے وقت

جدائی سے مغموم تھے ہی اب میں بھی ایک طویل مدت کے لئے جدا ہوں گا تو اُن کے دل پر کیا گزرے گی؟ بہر حال جانا تو تھا ہی، جہاز کو ساڑھے نو بجے شب میں روانہ ہونا تھا اس لئے میں احباب واعزا کے ایک قافلہ کے ساتھ آٹھ بجے پالم کے ہوائی اڈہ پر پہونچ گیا، وہاں معلوم ہوا کہ جہاز ایک گھنٹہ لیٹ ہے اس لئے میں نے سب سے مل ملا کر اُن کو واپس کر دیا اور تنہا ویٹنگ روم میں جا کر بیٹھ گیا، آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں، جہاز ۱/۲ ۹ بجے کے قریب آیا، دس بجے جہاز کا راستہ کھلا اور سب مسافروں کے ساتھ میں بھی جہاز میں اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا، ہوائی جہاز میں یہ میرا پہلا سفر نہیں تھا، اس لئے مجھ اس سے نہ صرف یہ کہ نامانوس نہیں ہوں بلکہ طبعی طور پر اسے پسند کرتا ہوں ٹھیک سوا دس بجے جہاز روانہ ہوا، چند منٹ تک نئی دہلی اور اس کے قرب وجوار کے آثار نظر آتے رہے، اس کے بعد جہاز ایک فضائے لامحدود میں گم ہو گیا، آسمان پر ستارے تو نظر آتے تھے مگر بستی کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا تھا، گویا دنیا اور اہلِ دنیا سے اب کوئی تعلق ہی باقی نہیں رہا تھا۔ (باقی)

سیرۃ النعمانؒ

سیرۃ النعمان علامہ شبلی نعمانیؒ کی نہایت قابلِ قدر تالیف ہے اس میں امام الائمہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات اور خصوصیات فقہ و استنباط کو ایک خاص اسلوب میں پیش کیا گیا ہے، امام اعظمؒ کے اجتہادی مسائل تقریباً بارہ سو برس سے تمام ممالک اسلامیہ میں پھیلے ہوئے ہیں، بڑی بڑی عظیم الشان اسلامی سلطنتوں میں اُن ہی کے مسائل قانونِ سلطنت تھے اور ہیں، اسلامی دنیا کا بیشتر حصہ اُن ہی کے مسائل کا پیرو ہے، عربی، فارسی، ترکی بلکہ یورپ کی زبانوں میں بھی اُن کی متعدد سوانح عمریاں لکھی گئیں، ظلم ہوتا اگر اُن کی سوانح اُردو میں نہ لکھی جاتی جو بلحاظِ غالب اُن ہی کے پیرووں کی زبان ہے، علامہ شبلیؒ نے امام موصوفؒ کے شایانِ شان یہ سوانح لکھ کر وقت کی بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے یہ عجیب بات تھی کہ عام ناشرین نے اس اہم کتاب کو کبھی اس کے مرتبہ اور حیثیت کے مطابق شائع کرنے کی سعی نہیں کی، ایک زمانہ میں لاہور سے اس کتاب کا نسبتاً صحیح ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ اور اس میں کچھ کارآمد حواشی بھی تھے، مکتبہ برہان نے اس ایڈیشن کی کتابت اُسی لاہور کے ایڈیشن سے کرائی ہے اور صحت کے ساتھ حسنِ طباعت کا بھی اہتمام کیا ہے، سائز متوسط صفحات ۴۴۲، قیمت تین روپے، پچاس پیسے **مکتبۂ برہان اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶**